جہاد اور ذہن جدید کے شبہات

اور آپ ﷺ کا نظریۂ جہاد

ڈاکٹر محمود احمد غازی

Abstract

There are many misconceptions and misunderstandings, created by non-Muslim scholars and authors in their research works. One of the misconception which they constantly presented, is that the religion of al-Islam is a religion of terror and war. And the aim of this religion is to engage its followers and others in the battlefield.This is absolutely a wrong concept about the religion of al-Islam. Infact Islam is the religion of peace.

Islam gives us the real concept of Jihad. We should keep in mind the number of battles and military engagements that the Prophet himself commanded or sent one of his Companions to Zcommand.In none of these battles, the number of which is more than sixty, was Allah's messenger on the attack. The prophet never attacked a tribe solely on the oneness of Allah (S.W.T.). basis that they had denied the

According to the teachings of the Noble Quran and the Sunnah of the Prophet Muhammad (peace be upon him) the of international relations is peace. War essential element is an exceptional situation.

The author has analyzed in detail, the terror has no place in the varying aspects of Jihad, and the religion of al-Islam is the religion of peace.

اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں بعض غیر مسلم مصنفین کی تحریروں سے پیدا ہوئی ہیں، مستشرقین کے اس رویے اور فکر سے دنیائے اسلام میں بہت سے لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ ان غلط فہمیوں میں سے ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام جنگ وجدل کا پیغام ہے جس کا مقصد خود بھی مسلسل جنگ وجدل میں مبتلا رہنا اور دنیا کو بھی اس جدال میں مبتلا رکھنا ہے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام وہ پہلا پیغام ہے جس نے قوت کے استعمال کو نتیجہ خیز اور مؤثر طور پر اخلاقی ضابطوں کا پابند بنایا ہے۔ جس نے ریاستوں کے تعلقات کو ایک ایسے اخلاقی نظام کے ذریعے استوار کیا ہے۔ جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔

مستشرقین کی پھیلائی ہوئی ان غلط فہمیوں اور ان سے متاثر ہونے والے مسلم اذہان کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے تصور جنگ و جہاد پر تفصیل سے گفت گو کی جائے۔

جب سے ہماری اس دنیا میں انسان آباد ہوا ہے اسی وقت سے انسان بل کہ پورا انسانی معاشرہ جنگوں اور اختلاف کا شکار رہا ہے۔ شاید انسانی تاریخ کا کوئی باب ایسا نہیں ہے جس میں جنگوں کے حالات اور انسانوں کے مابین پیدا ہونے والے اختلافات کا ذکر نہ ہوا ہو۔ دنیا کا کوئی تمدن اور مذہب ایسا نہیں ہے جس میں جنگوں، لڑائیوں اور آپس کے اختلافات کی بڑی بڑی اور ہول ناک مثالیں موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب سے آسمانی مذاہب کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور انسانوں نے روئے زمین پر مل جل کر رہنا سیکھا ہے اس وقت سے جنگوں اور لڑائیوں کو ناپسند بھی کیا جاتا ہے۔

دنیا کی کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں ہے، جس میں یہ کوشش نہ کی گئی ہو کہ جنگوں اور لڑائیوں کو کسی نہ کسی اصول کے تابع کیا جائے۔ ہندوؤں کی قدیم کتاب وید کے چاروں حصے ہوں، ہندوؤں کی مشہور قدیم رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت ہوں، یا قدیم یونانی دور کا فلسفیانہ اور مذہبی لٹریچر، ان سب میں ایسا مواد موجود ہے جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مفکرین زمانہ نے ہر دور میں یہ کوشش کی ہے کہ طاقت ور کو طاقت کے استعمال میں کسی اخلاق یا قانون کا پابند کیا جائے۔ لیکن ہندوستان میں کبھی بھی ان اخلاقی ضابطوں کی عملاً پابندی نہیں کی گئی، اور خود مذہبی راہ نماؤں تک نے اخلاقی اصولوں کو توڑنے میں عار محسوس نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قتل وغارت بے محابا جاری رہی اور تہذیب وتمدن کی تباہی ہوتی رہی۔

مہاتما بدھ کی تعلیمات سے ہم سب واقف ہیں، مختلف زمانوں کے بدھ مفکرین دنیا کو ہمیشہ یہ بتاتے رہے کہ مہاتما بدھ کسی قسم کی قوت اور طاقت کے استعمال کے سخت مخالف ہیں۔ اسی طرح حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو عیسائی دنیا کے دانش ور فخریہ دنیا کے سامنے ایک مثالی نمونے کے طور پر پیش کرتے رہے، جس کے مطابق ہدایت یہ ہے کہ اگر کوئی آپ کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو آپ دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نہ مہاتما بدھ کے کسی پیروکار نے اور نہ ہی عیسائی دنیا کے یسوع کے کسی نام لیوا نے ان اصولوں پر کبھی عمل کیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی عیسائی مملکت پر حملہ ہوا ہو اور عیسائیوں نے یہ کہہ دیا کہ ہو کہ ہم چوں کہ محبت اور پیار کے علم بردار ہیں اور جنگ سے نفرت کرتے ہیں لہذا ہم نہیں لڑتے، یہی حال بدھ مذہب کا ہے۔ اس مذہب کو ماننے والی جتنی مملکتیں ایشیا یا دنیا کے کسی اور خطے میں آج قائم ہیں یا ماضی میں قائم ہوئی ہیں ان سب کی تاریخ جنگوں اور قتل و غارت کے معاملے میں دیگر اقوام سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ عمل کی دنیا میں یہ اقوام خود بھی جنگ کے اسلامی تصور پر عمل پیرا ہیں، اور عملاً یہی سمجھتی ہیں کہ قوت کا استعمال اگر قانون و اخلاق کی طے کردہ حدود و قیود کے ساتھ ہو تو یہ فی نفسہ بری چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کا استعمال کسی قسم کے اخلاقی ضابطوں سے ماورا اور قانون کے اصولوں سے متجاوز ہو تو پھر واقعتاً وہ ایک قابل نفرت چیز ہے۔ اور انسانوں کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ انسانی معاشروں اور انسانی تہذیب و تمدن کو ان غیر اخلاقی جنگوں کے ہول ناک نتائج و عواقب سے نجات ملے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایک بڑی اصولی اور اہم بات ارشاد فرمائی ہے، وہ جہاد کی معاشرتی ضرورت پر گفت گو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اور کہ دنیا کا بہترین اور قابل عمل نظام وہ ہے کہ جس میں جنگ اور جہاد کا تصور تو موجود ہو لیکن اسے قانون و شریعت کی حدود سے محدود اور اخلاق و کردار کی قیود سے مقید کر دیا گیا ہو۔ (۱)

لہذا اگر کسی قانون اور شریعت کے نظام میں جنگ و جہاد کا کوئی واضح اور متوازن تصور نہیں ہے، تو ایسا نظام نا قابل عمل ہے اور کسی انسانی معاشرے کی حقیقی ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ ایسا نظام جس میں جنگیں کی جائیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بنیادی انسانی تصورات کی خلاف ورزی بھی کی جائے تو ایسا نظام کس طرح قابل عمل ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک نظریے کا علم بردار ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں کے لئے ایک واضح اصلاحی اور فلاحی پروگرام رکھتا ہے اور اس اصلاحی پروگرام کی کامیابی کے لئے اسلام صرف تبلیغ و تلقین پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بل کہ وہ اس کے نفاذ کے لئے

مثبت اور فعال انداز میں بھرپور کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نفاذ و اجرا اور اصلاح احوال کے لئے ایک فعال سیاسی اور عسکری قوت کی ضرورت ہے جو اسلامی ریاست فراہم کرتی ہے۔ لیکن اس قوت کی موجودگی کے باوجود ایسی صورت حال پیش آسکتی ہے کہ اندرونی یا بیرونی مخالف طاقتیں اس نظام کو ناکام بنانے یا سرے سے درہم برہم کرنے کی کوشش کریں، یا کسی اندرونی افراتفری کے نتیجے میں اس کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسی صورت حال میں ریاست جو دراصل قوت نافذہ ہے اور اسلام کے پیغام اور نظریے کی نشر و اشاعت اس کی ذمے داری ہے، اس کا کام یہ ہے کہ ان کوششوں کو ناکام بنائے، اندرونی اور بیرونی مخالف طاقتوں کو روکے اور افراتفری اور فتنے کو مٹائے۔ ریاست کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اس پیغام کا تحفظ کرے جس کی بنیاد پر وہ وجود میں آئی ہے (اور جو گویا اس کا مقصد وجود Raison d.etre ہے) اور بیرونی حملہ آوروں یا اندرونی افراتفری پھیلانے والوں کا سدِ باب کرے۔ اس سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات کو اسلام نے جہاد کا جامع اور منفرد عنوان عطا کیا ہے، جس کے بنیادی احکام قرآن مجید نے اور تفصیلات سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کردی ہیں۔

اسلام کائنات کے حقائق سے فرار کی نہیں بل کہ ان حقائق کے مکمل ادراک اور صحیح شعور کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ ان حقائق کے شعور کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے مسلسل کوشش کی جاتی رہے۔ ان حقائق کے ادراک میں ان قوتوں کا ادراک بھی شامل ہے جو شر کی علم بردار ہیں اور کائنات میں خیر کے خلاف کارفرما ہیں۔ خیر کے خیر ہونے کا تصور اس وقت تک ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ انسان شر کے تصور سے آشنا نہ ہو، اس لئے کہ اگر انسان شر کا ادراک نہ رکھتا ہو تو اس کو خیر کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اسلام روزِ اول سے ہی خیر کی بات کے ساتھ ساتھ شر کی بات بھی کرتا ہے۔ شر کے لئے جو قوتیں کارفرما ہیں ان کا ذکر بھی کرتا ہے اور شر کی ان قوتوں کے خاتمے اور سدِ باب کے لئے جس بالاتر سیاسی اور عسکری قوت کی ضرورت ہے اس کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس قوت کو کامیاب و کامران بنانے کے احکام بھی دیتا ہے۔

خیر و شر کے درمیان اسی کش مکش اور ستیزہ کاری کو خواہ وہ میدانِ علم میں ہو یا میدانِ حرب میں اسلام جہاد کا نام دیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے:

وجوب الجهاد وجوب الوسائل لا لمقاصد (۲)

جہاد کا وجوب دراصل وسائل کی نوعیت کا ہے، مقاصد کی نوعیت کا نہیں۔

بالفاظِ دیگر جہاد خود کوئی مقصد نہیں، بل کہ اصل مقصد کے حصول کا محض ایک وسیلہ ہے۔ کچھ احکام ایسے ہوتے ہیں جو بہ ذاتِ خود مطلوب ہوتے ہیں اور کچھ احکام ایسے ہوتے ہیں جو کسی اور حکم کے وجود یا تکمیل کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ جہاد فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ یہ ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اس لئے اس مقصد کی خاطر یہ بھی مطلوب ہے اور وہ مقصد قرآن کریم کی زبان میں یوں بیان ہوا ہے:

وقتلوھم حتی لاتکون فتنة ویکون الدین لله (۳)

اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔

جہاد ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، اور وہ یہ ہے:

و کلمة اللّٰه ھی العلیا (۴)

دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند ہو، اللہ کا نام لینے کی آزادی ہو، اور اللہ کی شریعت کو قائم کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں جو کوشش بھی کی جائے گی وہ جہاد کہلائے گی۔

قرآنِ پاک نے مختلف مقامات پر جنگ اور قوت کے استعمال کی اجازت دی ہے، اسلام نے اس نقطۂ نظر کو قبول نہیں کیا کہ جنگ اصلاً ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ اسلام کی نظر میں قوت ایک اچھی چیز ہے بہ شرطے کہ دینی اور اخلاقی حدود میں اس کا استعمال ہو۔ طاقت کا استعمال بالکل ٹھیک ہے اگر اخلاقی ضابطوں کے مطابق ہو اور قوت و طاقت کو استعمال کرنے والے اخلاقی پابندیوں اور ان کے استعمال کی حدود و قیود سے واقف ہوں۔

قرآن پاک میں جہاد کا لفظ مختلف معانی و مفاہیم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لغت عرب کے مشہور امام علامہ راغب اصفہانی نے جہاد کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے:

انہوں نے کہا کہ ایک جد و جہد تو وہ ہے جو کسی کھلے دشمن کے خلاف ہو۔ یعنی **مجاهدة العدو الظاهر**، میدانِ جنگ میں نکل کر دشمن سے معرکہ آزمائی۔

جد و جہد یا جہاد کی دوسری قسم **مجاهدة النفس** ہے، جو انسان کی اپنے نفس امارہ اور اپنے اندر موجود بدی کی قوتوں کے خلاف ہو۔

اور جہاد کی تیسری قسم وہ ہے جو شیاطین اور ابلیس کی ذریت کے خلاف ہو۔ یعنی **مجاهدة الشیطان** ۔(۵)

پھر وسائل کے اعتبار سے اس کی قسمیں بیان کی گئیں۔:

۱۔ ایک جدو جہد وہ ہے جو انسان تلوار سے کرتا ہے۔ جو اس پورے سلسلہ جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے اور اس کو اسلام کا ذروہ سنام یعنی سب سے بلند پایہ حصہ قرار دیا گیا، جو جدو جہد کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔

۲۔ ایک جدو جہد وہ ہے جو انسان اپنے علم کے ذریعے کرتا ہے۔

۳۔ ایک جدو جہد وہ ہے جو انسان اپنے مال کے ذریعے کرتا ہے۔

غرض کہ یہ تمام جہاد کی صورتیں ہیں۔ ان سب صورتوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ سب ایک مقصد کے لئے ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کی مدد و معاون ہوتی ہیں۔(۶)

لیکن ان تمام اقسام جہاد میں سے جہاد بالسیف یعنی تلوار لے کر میدانِ جنگ میں اترنا جہاد کی سب سے اعلیٰ اور بلند ترین قسم ہے۔ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کے دل کی تمنا قرار دیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

من مات و لم یغز، ولم یحدث به نفسه، مات علی شعبة من نفاق (۷)

اگر کسی مسلمان نے جہاد نہیں کیا اور (مجاہدین کے حالات و واقعات سن کر) اس کے دل میں شوقِ جہاد بھی پیدا نہیں ہوا تو ایسا شخص منافق ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا:

ولوددت انی اقتل فی سبیل الله، ثم احیا ثم اقتل، ثم احیا ثم اقتل (۸)

میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے دورانِ جہاد اللہ کے راستے میں قتل کر دیا جائے، مجھے پھر زندہ کیا جائے، اور مجھے پھر قتل کر دیا جائے، پھر مجھے زندہ کر دیا جائے اور میں پھر قتل کر دیا جاؤں۔

اس لئے کہ مقامِ شہادت اتنا بڑا مقام ہے اور یہ اعزاز ایسا اعزاز ہے کہ اس کو بار بار حاصل کرنے کی تمنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا:

لغدوة او روحة فی سبیل الله خیر من الدنیا و مافیها (۹)

اللہ کے راستے میں صبح کو نکلنا اور اس کے راستے میں شام کو نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

جہاد کا یہ تصور وہ ہے جو مسلمانوں کے ہاں روزِ اوّل سے چلا آتا ہے اور جب تک ایک مسلمان بھی دنیا میں موجود ہے یہ تصور اسی طرح باقی رہے گا:

الجهاد ماض منذ بعثني الله الى ان يقاتل آخر امتي الدجال لايبطله جور جائر ولا عدل عادل (۱۰)

جس دن سے اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے اس دن سے جہاد جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک میری امت کے آخری لوگ دجال کے خلاف لڑیں گے۔ اس کو نہ کسی ظالم کا ظلم ختم کر سکے گا اور نہ کسی عادل کا عدل۔

اس ارشاد گرامی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی وہ یہ کہ آئندہ ہر طرح کے حکم راں آئیں گے، اچھے بھی اور برے بھی۔ لیکن جہاد سب کی سربراہی میں ہوگا۔ یہ وضاحت اس لئے فرمائی کہ اس کا امکان تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں حکم راں بڑا فاسق و فاجر اور بڑا ظالم یا بڑا غیر سنجیدہ ہے، اس لئے اب جہاد ختم ہو گیا، اس لئے کہ ایسے نالائق اور غیر سنجیدہ حکم راں کی سربراہی میں جہاد جیسا مقدس اور سنجیدہ ترین فریضہ کیسے ادا ہو سکتا ہے۔ اس ممکنہ غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے فرمایا اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، یعنی حکم رانوں کی اس نااہلی کے باوجود جہاد جاری رہے گا، نہ ظلم کرنے والے حکم راں کے ظلم سے اس میں کوئی فرق پڑے گا اور نہ عدل کرنے والے حکم راں کے عدل سے اس میں کمی آئے گی، جہاد بہ ہر صورت جاری رہے گا، اور ہوتا رہے گا۔ اس لئے کہ جہاد کے اہداف و مقاصد میں کوئی چیز وقتی یا عارضی نہیں ہے۔

جہاد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا امتیازی وصف قرار دیا اور عمارت اسلام کا سب سے اونچا کنگرہ ٹھہرایا، اس لئے کہ دنیا میں مسلمانوں کی کام یابی و کام رانی اسی جذبہ جہاد سے وابستہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان جہاد کرتے رہے ہیں کام یابی و کام رانی ان کے قدم چومتی رہی ہے، اور جب سے انہوں نے اس راستے کو چھوڑ دیا ہے ذلت اور رسوائی ان کا مقدر ہو گئی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خلافت کی ذمے داری لیتے ہوئے جو پہلا خطبہ دیا تھا اس میں بھی یہی ارشاد فرمایا تھا کہ جو قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے اللہ تعالیٰ ذلت اور رسوائی اس کا مقدر بنا دیتا ہے۔

اسی طرح حضرت علیؓ نے خلافت کی ذمے داری سنبھالنے کے بعد جو پہلا بیان دیا تھا اس میں آپ نے بھی یہی فرمایا تھا کہ جو قوم جہاد کو چھوڑ دیتی ہے وہ اپنے گھر اور ملک کے اندر ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ دشمن اس کی کم زوری اور بزدلی سے فائدہ اٹھا کر اس کے گھر کے وسط میں جا گھستا ہے اور اس طرح مسلمان خود اپنے ہی گھر میں اور اپنے ہی ملک میں ذلیل اور کم زور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے

صحابہ کرام نے مسلسل جہاد کیا، تابعین نے جہاد کیا اور اُمت کے صلحانے ہر دور میں، ہر اچھے اور برے حکم راں نے جہاد کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اچھے اور برے ہر طرح کے دور آئے۔ ہر طرح کے نشیب و فراز سے واسطہ پڑا، طرزِ حکم رانی متأثر ہوئی، حکم راں بدلے۔ لیکن نہ جذبہ جہاد بدلا اور نہ کسی دور میں جہاد کا عمل رکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقصد جنگ پر بار بار زور دیا اور یہ ذہن نشین کرایا کہ مقصد جنگ نہ توسیع پسندی ہے اور نہ کسی فرد کی ذاتی خواہش کی تکمیل ہے۔ جہاد کا اوّلین و آخرین مقصد صرف اور صرف اسلامی دعوت کی تکمیل اور اس کے لئے اسباب فراہم کرنا ہے۔ اگر دعوت کے اسباب موجود ہیں اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، مسلمانوں پر کہیں بھی مظالم نہیں ہو رہے اور وہ دنیا میں ہر جگہ اپنے دین کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہیں تو اس صورت میں تلوار اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تتمنوا لقاء العدو وسلوا اللہ العافیۃ (۱۱)

تم دشمن سے مڈبھیڑ کی از خود تمنا اور خواہش نہ کرو اور اللہ سے عافیت ہی کی دعا کرو۔

اس کے ساتھ ساتھ خود حضور علیہ السلام کی جنگوں سے جو سبق ملتا ہے اور مختلف ہدایات جو آپ نے وقتاً فوقتاً دی ہیں ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب جنگ کی نوبت آجائے تو اس کا ہدف زیادہ سے زیادہ دشمن کا قتلِ عام نہ ہونا چاہئے بل کہ ہدف یہ ہونا چاہئے کہ کم سے کم خون بہایا جائے اور کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ دشمن کی قوت کو توڑ دیا جائے، تاکہ جو قوتیں اسلام کے خلاف کھڑی ہیں وہ اسلام کے مقابلہ کے لئے آئندہ پھر کھڑا ہونے کے قابل نہ رہیں اور اسلام کے راستے میں آگے چلے کر پھر کوئی رکاوٹ پیدا نہ کریں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع ملا کہ بغیر تلوار اٹھائے اسلام کے مقاصد حاصل کئے جاسکیں تو آپ نے جنگ سے گریز کیا اور خون بہائے بغیر اپنا مقصد پورا کیا۔ یہ بات ہمارے فقہائے کرام نے مختلف انداز میں بیان کی ہے۔ علامہ سرخسی نے لکھا ہے:

والمقصود لن یامن المسلمن و یتمکنوا من القیام بمصالح دینھم و دنیاھم (۱۲)

جہاد کا ہدف اور مقصود یہ ہے کہ مسلمان کو امن و سکون میسر ہو اور وہ اپنے دینی اور دنیاوی

مقاصد کی تکمیل امن کے ساتھ کر سکیں۔

گویا جہاد تین مقاصد کے حصول کے لئے ہے:

۱۔ مسلمان اور ان کے ہم وطن لوگ امن وامان سے رہ سکیں۔

۲۔ مسلمانوں کے دینی مقاصد پورے ہو رہے ہوں اور

۳۔ ان کے دنیوی مصالح کی تکمیل ہو رہی ہو۔

اگر یہ تینوں مقاصد جنگ کی نوبت آئے بغیر ہی پوری ہو جائیں تو جنگ کرنا ناجائز ہے اور اگر کسی وجہ سے ان تینوں میں کسی مقصد میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہو تو اس رکاوٹ کو دور کرنا اسلامی ریاست اور مسلمانوں کی ذمے داری ہے۔ پر امن طریقے سے دور ہو تو پر امن طریقے سے دور کریں اور اگر پر امن ذرائع ناکام ہو جائیں تو تلوار اٹھائیں۔ اسی لئے جہاد کو فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے، فرض عین نہیں۔ ان مقاصد کے حصول کی خاطر جنگ کی جو جو صورتیں جائز ہیں ان کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان پانچ صورتوں کے علاوہ کوئی اور صورت ایسی نہیں ہے جس میں مسلمان کے لئے تلوار اٹھانا اور کسی کے خلاف جنگ کرنا جائز ہو۔

سب سے پہلی آیت جس میں سن ۲ ہجری میں جنگ کی اجازت دی گئی وہ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، یہ ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (۱۳)

ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دے دی گئی جن سے کافر قتال کرتے ہیں کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

جس میں واضح طور پر یہ قرار دیا گیا ہے کہ جب مسلمانوں پر کھلی جارحیت کی جائے تو ان کے لئے جنگ ایک ناگزیر چیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اپنا دفاع کرنا ہر معاشرے کا، ہر نظام کا اور ہر قوم کا حق ہے تو مسلمانوں کا بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنا دفاع کریں۔ قرآن پاک میں جا بجا اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ (۱۴)

جو لوگ تم سے جنگ کریں تم بھی اللہ کے راستے میں ان کے خلاف جنگ کرو۔

دیکھئے یہاں خالص دفاعی جنگ کو بھی فی سبیل اللہ کی قید سے مقید کر کے اس میں ایک روحانی شان

اور اخلاقی جہت پیدا کر دی گئی ہے۔ اسی سیاق میں ایک جگہ آیا ہے:

فَإِنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (۱۵)

اگر دشمن تمہارے خلاف زیادتی کرے تو تم جواب میں ویسی ہی زیادتی اس کے خلاف کر سکتے ہو جیسی اس نے تمہارے خلاف کی ہے۔

جنگ کی دوسری جائز صورت کسی فتنے کو ختم کرنے کے لئے ہے۔ فتنہ خواہ اندر سے پیدا ہوا ہو یا باہر سے پیدا کیا گیا ہو اس کو ختم کرنے کے لئے جو جنگ کی جائے گی اس کو جنگ مصالح کا نام دیا گیا ہے۔ اگر ریاست کے اندر سے بغاوت ہو جاتی ہے، اندر سے کوئی گروہ مسلمانوں کے نظام کو درہم برہم کرنا اور وحدت ملی کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف تلوار اٹھائی جائے گی، یہ جائز ہے۔

تیسری صورت ہے مسلم اقلیتوں کے تحفظ کی خاطر یا غیر مسلم معاہدین کے تحفظ کی خاطر جنگ۔ فقہائے اسلام نے ان دونوں کے تحفظ کو یک ساں طور پر اہم قرار دیا ہے۔ کسی علاقے میں مسلم اقلیت آباد ہے۔ وہاں کی آبادی پر مظالم کئے جا رہے ہیں اور اسلامی ریاست کا اس ملک سے کوئی باقاعدہ معاہدہ دوستی وامن نہیں ہے کہ جنگ کرنے سے اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہو، تو اس صورت میں اسلامی ریاست کی ذمے داری ہے کہ مسلم اقلیت کا تحفظ کرے اور اس کو آزادی کی ضمانت دلائے جو وہاں اس کو میسر نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی ریاست سے دوستی کا معاہدہ رکھنے والے غیر مسلموں کے تحفظ کی خاطر بھی جنگ کی جاسکتی ہے۔

چوتھی صورت جنگ کی یہ ہے کہ کسی طویل جنگ کے تسلسل میں کوئی معرکہ پیش آجائے۔ گویا ایک جنگ پہلے سے چلی آتی ہے، کبھی بند ہو جاتی ہے اور کبھی چھڑ جاتی ہے اور مسلمان اپنی حکمت عملی یا اسٹریٹیجی کے تحت ایک مقررہ وقت پر ایک متعین ہدف کے لئے جنگ شروع کر دیں۔ جیسے مثلاً کشمیر میں جنگ جاری ہے۔ مجاہدین وہاں لڑ رہے ہیں۔ کبھی کئی کئی دن حملے کی نوبت نہیں آتی اور کبھی ایک دن تیاری کر کے حملہ کر دیتے ہیں۔ پھر ایک مہینہ خاموش ہو کر تیاری کرتے ہیں۔ یہ جو تسلسل ہے، اس کو ایک ہی جنگ شمار کیا جائے گا اور درمیانی وقفے کو حالت امن قرار نہیں دیا جائے گا۔ جو اسباب جنگ کے نقطۂ آغاز میں تھے، سمجھا جائے گا کہ وہ ابھی تک موجود ہیں، یعنی سابقہ جنگ کا تسلسل۔

آخری صورت جنگ کی وہ ہے جس میں دعوت اسلام کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے یا کسی سرکش کے خلاف فوجی ایکشن لینے اور سرکشی کے اسباب کا سدباب کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔ غزوہ

موتہ اس کی نمایاں مثال ہے۔ غزوہ موتہ کے لئے صحابہ کی جماعت ایک ایسے حکم راں کے خلاف بھیجی گئی تھی جس نے مسلمان سفیر کو قتل کرایا۔ اسلامی دعوت کا کام کرنے والوں کو پریشان کیا۔ حتیٰ کہ گزرنے والے مسلمان قافلوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ اس کو سزا دینے کے لئے اس کے خلاف لشکر کشی کی گئی۔

یہ تو جنگ کی وہ جائز صورتیں اور قسمیں ہیں جو قرآن پاک کے احکام اور حدیث کی تفصیلات کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اسلام سے پہلے جتنی بھی جنگیں ہوئیں، ان میں نہ تو جنگ کرنے والے کسی قانون کے پابند تھے اور نہ ان کے سامنے سرے سے کوئی قانونِ جنگ ہی موجود تھا۔ اور اگر کہیں کوئی قانون تھا بھی تو وہ اتنا سخت اور ناقابلِ عمل تھا کہ وہ اعتدال کی میزان اور انصاف کی ترازو میں پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ جیسا کہ یہودیوں کا قانونِ جنگ یا منوشاستر کی ہدایات جو بہت سخت اور ناقابلِ عمل احکام پر مشتمل ہیں۔ مثال کے طور تورات میں لکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی جنگ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے درمیان پیش آجائے اور مفتوحین ہتھیار ڈال دیں یا ان کو شکست ہو جائے یا وہ مصالحت کرنا چاہیں تو ان تینوں صورتوں میں مسئلے کو حل کرنے اور جنگ کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ مفتوحین کے تمام بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور منقولہ جائیداد کو مقاتلین میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ قانون ہے جو یہودیوں کے ہاں لکھا ہوا ہے اور یہی قانون ہے جس پر یہودی شاید آج کل فلسطین وشام کے عربوں کے بارے میں عمل پیرا معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں دوسری اقوام کے پاس ویسے ہی کوئی قانون جنگ موجود نہیں تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ طاقت ور فاتحین مفتوحین کے ساتھ جو رویہ اختیار کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار متعین ہدایات کے ساتھ فوجوں کو بھیجا۔ اور بڑی سختی کے ساتھ خود اپنی نگرانی میں ان کی پابندی کرائی، آپ کے بعد خلفا نے ان کی خود بھی پابندی کی اور دوسرے مسلمان قائدین سے بھی کرائی۔ ان ہدایات کا خاص حصہ یہ ہوتا تھا کہ بدعہدی نہ کرنا، مال غنیمت یا دوسرے سرکاری مال میں ہیر پھیر مت کرنا، دھوکا مت دینا، دشمن کے مقتولین کی لاشوں کو خراب نہ کرنا، ان کی توہین مت کرنا، کسی بچے کو قتل مت کرنا، کسی عورت کو قتل مت کرنا، جس لمحے دشمن اسلام قبول کر لے اسی لمحے جنگ سے رک جانا، جس لمحے وہ مسلمانوں کی بالادستی قبول کر لے فوراً جنگ بند کر دینا۔

پھر ایک اور بڑی اصلاح معاملات جنگ میں اسلام نے کی وہ یہ کہ اسلام سے پہلے جنگ کسی نظام

اور ڈسپلن کی پابند نہ تھی۔ جب جس کا جی چاہا اس نے لوٹ مار شروع کر دی اور کسی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جس نے جس علاقے پر قبضہ کر لیا وہ وہاں کا حاکم ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے اس بدنظمی اور افراتفری سے منع کیا اور پہلی بار یہ ہدایت دی کہ جہاد وہی ہے جو حکومت وقت کی سربراہی میں دستوری اور آئینی طریقے سے کیا جائے۔ امام ابو یوسف نے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لاتسری سریة بغیر اذن الامام (۱۶)

حکومت وقت یا سربراہ ریاست کی اجازت کے بغیر کوئی فوجی دستہ نہیں بھیجا جائے گا۔

ایک اور فقیہ نے یہ الفاظ اختیار کئے:

امر الجهاد موقوف الی الامام واجتهاد

جہاد جنگ کا معاملہ حکومت وقت کے فیصلے پر موقوف ہے۔ جب وہ فیصلہ کرے گی جب ہی شروع ہوگا۔

حتیٰ کہ شیعہ حضرات کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے۔ شیخ جعفر کلینی نے کہا ہے:

لایجب الجهاد الا بوجود الامام العادل اونائبه الخاص

امام عادل یا اس کے خصوصی نائب کے بغیر جہاد فرض ہی نہیں ہوتا۔

لہٰذا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ سربراہ ریاست کی اجازت کے بغیر اگر کوئی شخص ملٹری ایکشن لے گا تو اسے فتنہ قرار دیا جائے گا۔ اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

اس بات پر مسلمانوں کے تمام گروہ اور فقہا متفق ہیں کہ جب میدان جنگ میں مسلمان پہنچ جائیں اور جنگ کی نوبت آ جائے تو صرف ان لوگوں پر تلوار اٹھانا اور حملہ کرنا جائز ہے جو عملاً جنگ میں حصہ لے رہے ہوں۔ غیر مقاتلین کو قتل کرنا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا ہدایات جنگ سے واضح ہوتا ہے، جائز نہیں ہے۔ ان ہدایات پر جنگ کی شدت کے دوران بالخصوص اس زمانے کی دست بہ دست جنگ میں جتنا مشکل کام تھا ظاہر ہے۔ ایسی صورت حال میں کہ دشمن کے ملک میں فوج داخل ہو گئی ہو اور معرکہ عام شروع ہو گیا ہو اس میں کسی کو یہ تمیز نہ رہتی کہ کون جنگ کرنے کے لئے آیا ہے اور کون جنگ کرنے کے لئے نہیں آیا۔ اس افراتفری میں بھی اسلام نے (شاید تاریخ میں پہلی بار) یہ ہدایت کی کہ غیر مقاتلین کا قتل جائز نہیں۔ جو شخص تلوار نہیں اٹھاتا۔ چاہے وہ دشمن فوج کے ساتھ ہو، چاہے وہ دشمن کا آدمی ہو، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جو عملاً تلوار اٹھا کر لڑ رہا ہے صرف اسی کو قتل کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لئے

صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ راہبوں کو قتل نہیں کیا جائے گا، جو لوگ مذہبی طور پر تارکِ دنیا ہیں اور اپنے مندروں، گرجوں اور عبادت خانوں میں رہتے ہیں ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ نابینا کو قتل نہیں کیا جائے گا، خانہ بدوش سیاحوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ چرواہوں کو، مذہبی پنڈتوں اور پادریوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ایسے بوڑھے آدمی کو جو جنگ میں حصہ نہیں لے سکتا اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ کسی بے عقل، اور بیوقوف آدمی کو جس کی عقل درست نہیں ہے، قتل نہیں کیا جائے گا۔ عورت، بچے، بیمار، زخمی، معذور اور اپاہج کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

پھر اس طرح کے قتل کرنے کی ممانعت ساتھ ساتھ جو لوگ اس بات کے مستحق تھے بھی کہ انہیں میدانِ جنگ میں قتل کر دیا جائے، ان کے لئے بھی ہدایات یہ ہیں کہ ان کا مثلہ نہیں کیا جائے گا اور ان کی نعش کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی۔ اسلام سے قبل عرب میں دشمن مقتولین کے ناک، کان اور ہاتھ پاؤں کاٹ کر اس کی لاش کو اس طرح بگاڑ دینے کا رواج تھا کہ وہ پہچانی نہ جائے۔ اسلام نے اس طرح کی تمام ظالمانہ رسموں کا سدباب کیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کسی کو جلا کر نہ مارا جائے، کسی کو باندھ کر نہ مارا جائے، بس جو میدانِ جنگ میں مارا گیا وہ مارا گیا۔ شہر کے عام لوگوں کو مارنے کی ممانعت ہے۔ بل کہ جس لمحے فوج شہر میں داخل ہوگئی اس لمحے اس کے شہریوں کے جان و مال کی محافظ بن گئی۔ اب عام لوٹ مار کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر کسی نے ایک سوئی بھی لی تو قیامت کے روز وہ اسے آگ میں پہنچا سکتی ہے اور اس پر اس قدر باریک بینی کے ساتھ عمل کیا گیا کہ اگر واقعی کسی کو ایک سوئی بھی ملی تو اسے لا کر پیش کر دیا گیا۔

پھر اجتماعی مفادات کی چیزوں کو تباہ کرنے کی ممانعت ہے۔ غیر ضروری طور پر جانوروں کو، باغات اور کھیتوں کو، درختوں اور لکڑیوں کو، کارخانوں اور فیکٹریوں کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن اگر کسی اہم جنگی ضرورت کے لئے یہ ناگزیر ہو، مثلاً یہ کہ ایک بہت بڑی فوج حرکت کر رہی ہے اور اس کے لئے لکڑیوں کی ضرورت ہے تو درختوں کو کاٹا جا سکتا ہے مگر تباہی برائے تباہی اور محض دشمن کے علاقہ کو برباد کرنے کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر کچھ مزید ہدایات جن پر جنگ کے دوران عمل درآمد کیا جائے گا ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی جنگی قیدی تمہاری گرفت میں آجائے تو اس کے بارے میں کسی قسم کی بدعہدی یا دھوکہ نہیں برتا جائے گا۔ جو تاثر دے کر ان کو گرفتار کیا گیا تھا اس تاثر کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی اور جو یقین دہانی کرائی گئی تھی اس کی مکمل پابندی کی جائے گی۔ قطع نظر اس کے کہ وہ یقین

دہائی کسی ایک فرد نے کرائی ہو یا پوری فوج نے کرائی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یسعی بذمتھم ادناھم (۱۷)

سب مسلمان برابر ہیں اور ایک مسلمان اگر کوئی ذمے داری لے لیتا ہے تو وہ ذمہ داری مسلمانوں کی پوری جماعت پر عائد ہوتی ہے۔

جنگ کے دوران کسی حرام کام کا ارتکاب نہیں کیا جائے گا۔ عام حالات کی طرح حالت جنگ میں بھی ہر قسم کی بداخلاقی سے اجتناب کیا جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اگر دشمن کے کوئی قیدی بہ طور یرغمال ہمارے پاس ہوں اور ہمارے قیدی بہ طور یرغمال ان کے پاس ہوں اور دشمن ہمارے قیدیوں کو قتل کردے تو جواب میں ہم اس کے قیدیوں کو قتل نہیں کریں گے، اور اگر کوئی مسلمان اتفاقاً دشمن کے قیدیوں کو از خود قتل کردے تو اس پر قتل کا مقدمہ چلایا جائے گا اور اس کو قانونِ اسلام کے مطابق سزا دی جائے گی۔ اس لئے کہ قرآن پاک میں مذکور ہے کہ کسی کے جرم کا کوئی اور ذمے دار نہیں ہوگا۔ لہٰذا اگر دشمن نے ہمارے آدمی کو قتل کردیا ہے تو ہم جواباً اس کے آدمی کو قتل نہیں کریں گے۔ کیوں کہ ہم قیدیوں کے اپنے جرم کی سزا تو ان کو دے سکتے ہیں، لیکن کسی اور کے جرم کی سزا ان قیدیوں کو نہیں دے سکتے۔

ایک اور اہم چیز قانونِ جنگ کی اصلاح سے متعلق مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کے بارے میں اصلاح ہے۔ اسلام سے پہلے اور اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اور آج بھی بڑی حد تک دشمن کی جنگی ممتلکات کے بارے میں کوئی واضح قانون، طے شدہ ضابطہ اور متعین اور دوٹوک نظام موجود نہیں ہے۔ اسلام نے پہلے دن سے اس کا ایک ضابطہ مقرر کیا اور یہ کہا کہ دشمن کی وہ تمام اشیا اور مملوکات جو میدانِ جنگ میں ہاتھ آئیں یا وہ اس کی سرکاری املاک جو فاتح سرکار کی ملکیت میں آجائیں اس کے بارے میں دو بنیادی اصول مقرر کردیئے۔ ایک یہ کہ دشمن کو ان اسباب و وسائل سے فائدہ اٹھا کر دوبارہ مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہونے کا موقع فراہم نہ کیا جائے دوسرے یہ کہ ان مملوکات اور ساز و سامان سے حتی الامکان مسلمانوں کو استفادہ کا موقع دیا جائے۔

جنگی قیدیوں کا مسئلہ اسلام میں بڑے متوازن طریقے سے حل کیا گیا۔ دورِ جدید میں اسلام پر سب سے زیادہ اعتراضات جنگی قیدیوں ہی کے حوالے سے کئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے غلامی کو کیوں باقی رکھا؟ اس کو بالکل ہی ختم کیوں نہیں کیا؟ اس سے بھی آگے بڑھ کر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کو پھیلایا۔ حال آں کہ واقعہ یہ ہے کہ نہ اسلام نے غلامی کو پھیلایا، نہ اسلام نے غلامی کا حکم دیا اور

نہ غلامی کو کوئی پسندیدہ عمل قرار دیا۔ اسلام کی کتاب تو دنیا کی وہ واحد مذہبی کتاب ہے جس میں جا بہ جا غلاموں کی آزادی کا ذکر کثرت اور تکرار سے ملتا ہے۔ دنیا میں کوئی اور ایسی مذہبی کتاب مشرق و مغرب میں موجود نہیں ہے۔ نہ تورات نہ انجیل نہ کوئی اور جس میں غلاموں کی آزادی کو مذہبی عبادت کا حصہ قرار دیا گیا ہو۔ جس میں خالص دینی و مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرنے پر بہ طور کفارہ غلام کو آزاد کرنا لازمی قرار دے دیا گیا ہو۔ جس میں گردنیں آزاد کرنے کے عمل کو نیکی کی ایک بڑی گھاٹی کو عبور کر لینے کے مترادف ٹھہرایا گیا ہو۔ نہ تورات میں ایسا ہے نہ انجیل میں۔ تورات میں تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ کہا گیا ہے کہ جنگ میں فتح کی صورت میں بچوں اور عورتوں کو تو لازماً غلام بنا لیا جائے اور جملہ مردوں کو قتل کر دیا جائے اور اگر کہیں سے ویسے ہی ہاتھ آ جائیں تو مردوں کو بھی غلام بنا لیا جائے۔

اسلام سے قبل غلامی کی جتنی صورتیں موجود تھیں اسلام نے ان سب کو ختم کر دیا۔ رومن قانون میں جس کے تہذیبی معیار کی ایک دنیا قائل ہے حکم یہ تھا کہ مقروض اگر قرض نہیں دے سکتا تو اس کو غلام بنا لیا جائے۔ کہیں یہ تھا کہ اگر کوئی شخص چوری کا ارتکاب کرے اور مال مسروقہ اس سے برآمد ہو تو اسے غلام بنا لیا جائے۔ کسی جگہ ماں باپ کو حق تھا کہ اگر چاہیں تو اپنی اولاد کو فروخت کر کے رقم وصول کر لیں اور اولاد کو زندگی بھر کے لئے غلامی میں دے دیں۔ کہیں یہ رواج تھا کہ کوئی شخص اگر بے کار پایا جائے تو اسے فروخت کر دو۔ اسلام نے ان سب طریقوں کو ختم کر دیا۔ صرف ایسے جنگی قیدیوں کو جو میدان جنگ میں قیدی بنیں اور ان کے بارے میں دوسرے متبادل احکام پر عمل کرنا ممکن یا قرین مصلحت نہ ہو یا مفاد عامہ کے خلاف ہو تو اس صورت میں ان جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ اسلام سے پہلے سے جاری ہے، اسے انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو نہیں روکا۔

ایک مسیحی مصنف اس بارے میں انجیل کے طرز عمل کا دفاع کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے غلامی کو روکا لیکن غلامی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قائم نہیں کی تھی بل کہ پہلے سے قائم تھی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے عالم گیر طریقے کو یک طرفہ طور پر نہیں روک سکتے تھے جو بین الاقوامی سطح پر رائج ہو۔ وہ کسی ایسے رواج کو ختم نہیں کر سکتے تھے جس کو عالمی سطح پر پسند کیا جاتا ہو۔

یہ جواب جو عیسائی حضرات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دیتے ہیں وہی جواب قرآن کی طرف سے بھی دیا جا سکتا ہے کہ غلامی کا رواج ایک بین الاقوامی معاملہ تھا جس کو یک طرفہ طور پر کوئی فریق ختم نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن یہ بات ہرگز فراموش نہ کرنی چاہئے کہ اسلام نے غلاموں کو جو مقام دیا اس سے ثابت ہوتا ہوتا ہے کہ اسلام میں غلامی کا ادارہ دوسرے تمام مذاہب واقوام کے ادارے سے مختلف تھا۔ اسلام میں نہ صرف غلاموں کے ساتھ کوئی نامناسب رویہ نہیں رکھا گیا بل کہ ان کا معاشرتی درجہ ایک بڑے سے بڑے انسان کے برابر کر دیا گیا۔ ہندوستان اور مصر میں ممالیک کی حکومت طویل عرصے تک قائم رہی، یہ اکثر حکم ران غلام تھے، اس کے علاوہ مسلم تاریخ میں بڑے بڑے علما، صلحا، فاتحین اور بزرگانِ دین یا تو غلام تھے یا غلام زادے تھے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلام کا ادارہ غلامی ان کے لئے رحمت ثابت ہوا، نہ کہ زحمت۔

خلاصہ یہ کہ غلامی اگر چہ ایک بڑی ناپسندیدہ چیز ہے اور اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جتنا جلد ہو سکے اس کو ختم کیا جائے۔ لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیش آ سکتے ہیں کہ اس ناگزیر برائی کو اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جیسے طلاق کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا:

ابغض الحلال عند الله الطلاق (۱۸)

حلال چیزوں میں سب سے زیادہ بری چیز اللہ کے ہاں طلاق ہے۔

دیکھئے طلاق کو ناپسندیدہ کہا گیا، لیکن حرام نہیں قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ بعض اوقات یہ ناپسندیدہ چیز ایک ناگزیر صورت ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی اور مثالیں بھی ہیں کہ شریعت نے ایک چیز کو ناپسندیدہ کہا لیکن حرام قرار نہیں دیا۔ اسی طرح غلامی حرام اس لئے نہیں کی گئی کہ بعض اوقات جنگی قیدیوں کا مسئلہ حل کرنے کی اس کے علاوہ کوئی اور صورت اسلامی نقطہ نظر سے قابل عمل نظر نہیں آتی۔

آپ غور کیجئے کہ جہاں بڑی تعداد میں جنگی قیدی ہوں۔ خاص طور پر بڑی جنگوں میں بڑی تعداد میں آئیں گے۔ ان کا ڈسپوزل کیسے کیا جائے گا۔ غور کریں تو اس کی کئی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں۔ مثلاً میں جاپان و جرمنی کی مثال دیتا ہوں۔ دوسری جنگ عظیم میں صرف روس اور جرمنی کے تقریباً دو کروڑ افراد مارے گئے، اسی طرح سے اتنی ہی تعداد میں جاپانیوں اور دوسری اقوام کا نقصان ہوا۔ فرض کیجئے کہ اس جنگ میں مسلمان فاتح ہوتے اور اتنی تعداد میں دشمن مارے گئے ہوتے تو ایسی صورت میں ان کروڑوں عورتوں کا جو جنگی قیدی ہوتیں کیا حل ہو سکتا تھا۔

ایک طریقہ یہ تھا کہ آپ ان جنگی قیدیوں کو بڑے بڑے باڑے اور قید خانے بنا کر ان میں بند کر دیں۔ جس طرح کہ ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ کیا اور آج تک دنیا اس کو برے نام سے یاد کرتی ہے۔

دوسری بہتر صورت یہ ہے کہ ان کروڑوں عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ ایک حل اس کا یہ تھا کہ ان سے جبری مشقت لی جاتی اور جبری مشقت کے لئے ان کو زبردستی کھیتوں اور کارخانوں میں کام پر لگا دیا جاتا لیکن اس جبری مشقت کے لئے بھی ان کو گھروں کی، کپڑے کی اور دو وقت کھانے کی ضرورت پڑتی۔ ان سب چیزوں کا بندوبست ریاست کہاں سے کرتی؟ پھر ان کروڑوں جوان عورتوں کو یوں ہی بے شوہر رکھنے سے دوسری اخلاقی اور نفسیاتی خرابیاں پیدا ہوتیں۔

ایک حل یہ تھا کہ ان قیدی خواتین کو ویسے ہی مسلم معاشرے میں چھوڑ دیں کہ یہ کروڑوں بے سہارا، بے شوہر اور بے گھر عورتیں جو چاہیں کریں۔ اگر یہ قیدی جنگی صلاحیت رکھنے والے مرد ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اتنی بڑی تعداد میں جن مفتوحین کو دشمن سے توڑا ہے اسے واپس دشمن کو لوٹا دیا جائے اور وہ دوبارہ آپ کے مقابلے میں اسی طرح کھڑے ہو جائیں جیسے جرمنی پہلی جنگ عظیم کے بعد دوبارہ ایک خطرہ بن گیا۔

ایک آخری حل یہ ہے کہ ان جنگی قیدیوں کے بارے میں کوئی ایسا طرز عمل اختیار کریں کہ وہ بالآخر مسلم معاشرے کا ایک حصہ بن جائیں اور کچھ عرصے مسلم معاشرے میں رہ کر وہ اسلامی تہذیب کو اپنا لیں اور یوں آخر کار معاشرے کے باعزت شہری بن جائیں۔ اسلام نے ان کے بارے میں یہ آخری طرزِ عمل اختیار کیا جو ماضی کے رائج شدہ سارے طریقوں سے مختلف تھا۔ اس طرزِ عمل سے اس نے لاکھوں افراد کو جینے کا حق دے کر معاشرے کا باعزت شہری بنا دیا، اور یہ طرزِ عمل ماضی کے تمام مروجہ طریقوں سے زیادہ کامیاب رہا۔ رہا سوال کہ واضح طور پر اس کو ختم نہیں کیا۔

آپ فرض کریں کہ پچاس لاکھ جنگی قیدیوں کی تعداد آ جائے جیسا کہ جرمنی میں ہوا۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ انہیں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے یہ ظالمانہ اقدام ہے۔ جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ایک یہ ہے کہ آپ ان کو معاشرے میں ویسے ہی کھلا رہنے دیں۔ اس سے وہ بداخلاقی پیدا ہوگی جس کا سامنا جاپان اور جرمنی کو کرنا پڑا۔ اور مسلم معاشرہ اس انارکی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ایک یہ کہ آپ ان کو خاندانوں کا حصہ بنا کر انہیں بکھیر دیں کہ وہ بداخلاقی کے مرتکب بھی نہ ہوں اور ان کی ضروریات کی تکمیل بھی ہو اور کچھ عرصے کے بعد یہ کیفیت ہو کہ پتہ نہ چلے کہ آزاد کون ہے اور غلام کون۔ آزاد غلام یوں ملیں جلیں کہ باہم رشتہ داریاں تک قائم ہو جائیں۔

میرے خیال میں یہ معقول ترین طریقہ تھا جو اسلام نے اختیار کیا۔ آپ اس کو عارضی قید بامشقت

کہہ سکتے ہیں جس کے لئے قید خانوں اور جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کے بہ جائے کھلے ماحول اور آزاد معاشرے کا انتخاب کیا گیا اور قیدی اس مقصد کے لئے گھروں میں بانٹ دیے گئے۔

یہ خلاصہ ہے جہاد کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا، جس کے نتیجے میں جہاد عام جنگ و جدال کے برعکس ایک اخلاقی ادارے کے طور پر سامنے آتا ہے، جو جنگ کی ضرورتوں کی بھی تکمیل کرتا ہے، اور اس کے مفاسد سے بھی معاشرے اور کائنات کی حفاظت کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہ ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغۃ۔ دار الجیل ۲۰۰۵ء: ج ۲، ص ۲۶۲

۲۔ ابن دقیق العید۔ اوجز المسالک: ج ۸، ص ۲۰۱ کے حوالے سے عبارت یوں ہے: القیاس یقتضی ان الجهاد افضل الاعمال التی هی وسائل۔ التعلیق الممجد علی موطا محمد: ج ۲، ص ۸۸

۳۔ البقرہ: ۱۹۳

۴۔ التوبہ: ۴۰

۵۔ راغب اصفہانی۔ المفردات فی غریب القرآن۔ تحقیق صفوان عدنان الداودی۔ دار القلم، طبع اول: ۱۴۲۱ھ: ج ۱، ۲۰۸

۶۔ ایضا

۷۔ صحیح مسلم: باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث، رقم ۱۹۱۰۔

☆ سنن ابی داود: کتاب الجہاد

☆ سنن نسائی: کتاب الجہاد، باب ۲

۸۔ صحیح البخاری: باب الجہاد من الایمان، رقم ۳۶۔ واطرافہ رقم الحدیث: ۲۷۸۷، ۲۷۹۷، ۲۹۷۲، ۳۱۲۳، ۷۲۲۶، ۷۲۲۷

۹۔ سنن ابن ماجہ: باب الغدوۃ والروحۃ فی سبیل اللہ، رقم ۲۷۵۷۔

۱۰۔ سنن ابی داود: باب فی الغزو مع ائمۃ الجور، رقم ۲۵۳۲۔

۱۱۔ صحیح البخاری: باب کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا لم یقاتل اول النہار اخر القتال حتی تزول الشمس، رقم ۲۹۶۶۔

۱۲۔امام سرخسی۔المبسوط، کتاب السیر: ج۱،ص۳

۱۳۔الحج:۳۹

۱۴۔البقرۃ:۱۹۰

۱۲۵۔البقرۃ:۱۹۴

۱۶۔ ابن ابی شیبۃ۔المصنف:باب فی السریۃالتی تخرج بغیر اذن الامام، رقم ۳۳۲۳۶۔

۱۷۔سنن ابی داود:باب فی السریۃ ترد علی العسکر،رقم،۲۷۵۱

☆ کنز العمال:رقم،۴۴۴،الفرع الثانی فی احکام الایمان المتفرقۃ۔

۱۸۔روضۃ المحدثین:ج۳،ص۶۶،رقم۴۲۱۸

☆

اردو کتابیات سیرت

حافظ محمد عارف گھانچی

صفحات:۲۶۴ قیمت:۲۲۰روپے

اہتمام

دارالعلم والتحقیق برائے اعلیٰ تعلیم وٹیکنالوجی

ناشر

کتب خانۂ سیرت

کھتری مسجد۔لی مارکیٹ صدر ٹاؤن۔کراچی

فون:0321-2834249